ریت پہ بہتا پانی

قاسم یعقوب

ریت پہ بہتا پانی

(نظمیں)

قاسم یعقوب

آج کی کتابیں، کراچی

ریت پہ بہتا پانی
(نظمیں)

ISBN:969-8379-92-6
پہلی اشاعت: مارچ/ ۲۰۱۰ء
سرورق: عمار انجم

قاسم یعقوب
P-240، رحمن سٹریٹ، سعید کالونی، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد
+92-323-5005647
niqaat@gmail.com

زیر اہتمام
آج کی کتابیں

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5650623, 5213916 (92-21)
ای میل: info@aajurdu.com, ajmalkamal@gmail.com

ترتیب

نظمیں

قاسم یعقوب کی نظم اور قرأت کا نیا لسانی مظہر

میراجی سے اب تک، اُردو میں لکھی جانے والی جدید اُردو نظم کی تفہیم ایک دشوار گزار عمل سمجھی گئی ہے۔ دشواری خود نظم کی ساخت و شعریات میں ہے یا اس نظم کے قارئین کے ذوقِ تفہیم میں گڑبڑ ہے؟ دونوں سوالات پر خاصی بحث ہو چکی ہے اور اس بحث نے جدید نظم سے لطف اُٹھانے اور اس کی تفہیم کی راہ میں حائل دشواری کو کم کیا ہے، ختم نہیں کیا۔ اس ضمن میں ایک بات بالکل واضح ہے: جدید نظم کا مطالعہ، جدید شعریات کے واضح علم کے بغیر مفید تو کجا ممکن بھی نہیں۔ جو لوگ اس بیّن حقیقت کو ملحوظ نہیں رکھتے یا قبول نہیں کرتے، ان کے لیے جدید نظم معمّا بنی رہتی ہے اور جب وہ اس معمّے کو حل نہیں کر پاتے تو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے، نظم کی نام نہاد فنّی نارسائیوں اور ناکامیوں کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ 'جدید شعریات' کے علم کو جدید نظم کے مطالعے سے مشروط کرنے کا مطلب، تخلیق پر تنقید کی برتری جتانا نہیں، جیسا کہ بعض کرم فرما سمجھتے ہیں بلکہ جدید نظم کی تفہیم میں حائل دشواری کا احساس دلانا اور اسے دور کرنے کی صورت کی نشان دہی کرنا ہے...... مجھے افسوس ہے کہ اکیسویں صدی کے اختتام پر ایک نئے نظم گو: قاسم یعقوب کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس بحث کا اعادہ کرنا پڑا ہے، جس کا آغاز ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ہوا تھا۔ اس ناگوار اعادے کا باعث راقم کا 'ذوقِ تکرار' نہیں، جدید نظم کی تفہیمی صورتِ حال کا گزشتہ ستر برس سے استقرار ہے۔

جدید نظم کی شعریات کی ایک اہم رمز یہ ہے کہ یہ حقیقت کی ترجمانی اور نمائندگی نہیں کرتی۔ جو اصنافِ ادب، ترجمانی و نمائندگی کو ایک اصول کے طور پر قبول کرتی ہیں، ان کی تفہیم میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ ان کے مطالعے میں قاری کے اس شعور کو دھچکا نہیں لگتا جو ایک طرف روزمرہ کی حقیقتوں سے جڑا ہوتا ہے اور انھی کے ہاتھوں خط وخال پاتا ہے اور دوسری طرف (ان حقیقتوں کے) نمائندہ ادب کے مطالعے میں سرگرم ہوتا ہے۔ شعور کو دھچکا نہ لگے تو اس میں گہرائی پیدا ہوتی ہے نہ وسعت۔ جدید نظم کے مطالعے میں یہی شعور غیر متوقع اجنبیت، پریشان کن ترتیب وتسلسل، کبھی کبھی چکرا دینے والے پیرایہ اظہار...... سے دوچار ہوتا ہے اور ہچکولے کھاتا ہے اور اگر ہچکولوں کو جھیل جائے تو وسعت آشنا ہوتا ہے اور ارتفاعی کیفیت بہ انعام پاتا ہے۔ جدید نظم میں یہ سب کھکھیڑ کیوں؟ غالباً اس لیے کہ جدید نظم دنیا کی ترجمانی کی بجائے دنیا کی قرأت کرتی ہے۔ ترجمانی براوراست ہو یا علامتی، دنیا اور حقیقت کی ترسیل کم وبیش اسی طرح کرتی ہے جس طرح لفافے میں خط، جب کہ قرأت ایک تخیلی، لسانی مظہر کو وجود میں لانے کا عمل ہے۔ نظم حقیقت کی قرأت یعنی Decipher کرتی ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت بیّن، ٹھوس، عین سامنے اور یک سر صریح نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی سریّت، ابہام، الجھاوا، غیاب اور رمزیت ہے۔ جدید نظم اسی کو Decipher کرنے کی سعی کرتی ہے۔ یہاں واضح رہے کہ جدید نظم میں حقیقت کی روایتی موضوعی اور معروضی تقسیم موجود نہیں ہے۔ جدید نظم پر یہ سراسر اتہام ہے کہ وہ موضوعی حقیقت کو پیش کرنے کی بنا پر ابہام سے لبریز ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ آدمی اور دنیا یا داخل اور خارج، دونوں کو Decipher کرنے کی ذمے داری قبول کرتی ہے۔ اس کے لیے دونوں یکساں طور پر رمز کشائی کی طالب ہیں۔

قرأت کا لازمی نتیجہ ایک 'نیا تخیلی ولسانی مظہر' ہے جس کا حقیقت سے رشتہ نمائندگی کا نہیں، مکالمے کا (Dialogic) ہے۔ دوسرے لفظوں میں جدید نظم جس 'تخیلی ولسانی مظہر' سے عبارت ہے وہ کہیں حقیقت کے ہاتھوں تشکیل پذیر ہوتا اور کہیں حقیقت کو نئے سرے سے تشکیل دیتا ہے۔ یہ عمل (process) جدید نظم میں مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اس عمل کا اظہار جدید نظم کی اُس

نئی زبان میں ہوتا ہے جو نئے امیجز، تازہ استعاروں اور نئی علامتوں سے عبارت ہوتی ہے۔

اس مختصر بحث کی روشنی میں قاسم یعقوب کی نظمیں دیکھیں تو ان میں حقیقت کی قرأت کا یہ مکالماتی عمل برابر متحرک دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ ان نظموں میں حقیقت کی وہ تقسیم اور درجہ بندی موجود نہیں، جس کا ذکر اوّل اوّل ترقی پسندوں نے کیا اور اسے جدید نظم کے استرداد کے ایک فنی حربے کے طور پر کیا اور بعد ازاں جدید شعریات سے بے خبر یا لاتعلق حضرات نے شدّ و مد سے کیا۔ قاسم یعقوب نے "مرے لیمپ کی روشنی پوچھتی ہے، بارود کی بُو، چہرے کی گرد" جیسی نظمیں لکھی ہیں جن کا پس منظر قدرتی آفات، انسانی ہوسِ فتح اور معاصر عہد کی بے ہنگم مشینی تہذیب ہے اور دوسری متعدد نظموں،...... "تخلیق نروان دیتی ہے، دھوپ کی بارش، کبھی کبھی جی کرتا ہے، اپنے جیسے ایک دوست کے لیے، ایک کتبے کی تلاش میں، ایک اور دن، کچی عمر کا لڑکا"...... میں محبت، ہجر، خالی پن، تنہائی، وقت، بچپن کی معصومیت، فطرت پر انسان کے مظالم وغیرہ کی قرأت کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک حقیقت قاشوں میں بٹی ہوئی چیز نہیں۔ جہاں حقیقت کا یہ ثنوی تصور موجود ہوتا ہے وہاں ایک اقداری درجہ بندی بھی لازماً ہوتی ہے: حقیقت کی ایک قاش، دوسری سے زیادہ اہم، دوسری کو رَدّ کرنے والی اور اپنی برتری کا علم خود اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوتی ہے۔ قاسم یعقوب کے لیے حقیقت اکائی کی صورت ہے، اس لیے یکساں طور پر قرات کیے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس امر کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم "برگد کی واپسی" ہے۔

قاسم یعقوب کی نظموں میں بچے کا کردار خاصا نمایاں ہے۔ کہیں تو بچہ باقاعدہ نظم کا مرکزی کردار ہے اور کہیں بچے سے ثقافتی طور پر وابستہ صفات کو نظم میں اُبھار اگیا ہے؛ کہیں دوسری صفات سے تقابل کے طور پر اور کہیں مجرد طور پر...... نظم "برگد سے واپسی" میں مرکزی کردار ایک بچی ہے، مہاتما بدھ کی اسطورہ کی قرأت کرتی ہے۔ اس اسطورہ کو Decipher کرتی ہے، محض پڑھتی نہیں ہے۔ اسے مہاتما بدھ کے کردار اور نظریات کے اس سیاق سے کوئی تعلق محسوس نہیں ہوتا یا وہ اس کی نمائندگی میں ذرا دلچسپی محسوس نہیں کرتی جو عام طور پر بدھا سے وابستہ ہے اور جس کے تحت بدھا کے تیاگ اور نروان کو عظیم عارفانہ یافت قرار دیا گیا ہے۔ دیکھیے وہ بچی بدھا کی کیا

قرأت کرتی ہے:

گھنے برگد کے سائے میں پڑے رہنے سے
اُس کی گال پر سورج کا بوسا ہی نہیں ہے
اُس کے سر کے بال کی سب تازگی جنگل کے سبزے میں پڑی ہے

اسے بدھا پہ رحم آیا
وہ بچی ہاتھ میں پنسل پکڑ کر سوچتی ہے
اور پھر تصویر کے اوپر
لکیریں کھینچ کر مونچھیں بناتی ہے
اور اس تبدیلی سے اندر ہی اندر مسکراتی ہے
کہ جیسے اس نے دانش کی بھی کمزوریاں
اپنی لکیروں سے چھپا دی ہیں

غور کیجیے: نظم میں مکالماتی(Dialogic) رشتہ کس عمدہ انداز میں ظاہر ہُوا ہے! ایک مسکراہٹ کپل دستو کے شہزادے کو برگد کے درخت کے سائے میں عطا ہوئی تھی جو اس کی طویل ریاضت اور مراقبے کا ثمر تھی اور ایک مسکراہٹ اس بچی کے اندر پیدا ہوئی ہے جب وہ بدھا کی تصویر پہ مونچھیں اگاتی ہے۔ دونوں کی مسکراہٹ کا فرق بھی ملاحظہ کیجیے: بدھا کی مسکراہٹ دنیا کو ترک کرنے اور ایک نئے عالم کی معرفت حاصل کرنے کا نتیجہ تھی، جب کہ بچی کی مسکراہٹ دنیا کو اپنے تخیل کے مطابق تبدیل کرنے کا ثمر ہے۔ دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ وہ مونچھیں ہی کیوں تصویر پر اگاتی ہے؟ آخر دنیا کو تبدیل کرنے کے اس کے تخیل کا اظہار اس طرح ہی کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ محض ایک بچے کی چیزوں کو بگاڑنے کی جبلت کا اظہار ہے؟ چوں کہ نظم میں بدھا کے متن کی قرات کا عمل نمایاں اور سنجیدہ ہے، اس لیے نظم کو ایک بچے کی عمومی کرداری نظم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اصل یہ ہے کہ نظم کے ہر پہلو کو، نظم کی معنی خیزی کے پورے عمل کا لازمی حصہ قرار دیا جا سکتا

ہے۔لہٰذا یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ نظم میں مونچھیں مردانگی کی علامت ہیں یا اُس جنگل کی جس
میں بدھا کے بالوں کی تازگی پڑی رہ گئی تھی؟ اس سوال کے جواب کی تلاش ہی میں نظم کے تخیلی و
لسانی مظہر کا مکالماتی انداز پھیلتا محسوس ہوتا ہے۔بچی نے بدھا کے متن میں کوئی ایسا خلا یا
rupture ضرور محسوس کیا،جس کو صرف مونچھوں ہی سے بھرا جا سکتا تھا۔کہیں یہ بچی یشودھرا کا
اساطیری جنم تو نہیں!اس یشودھرا کا جسے سدھارتھ رات کے اندھیرے میں تیاگ کر جنگل کی طرف
چلا تھا۔کیا نئے زمانے کی یشودھرا اس نروان پر نیم طنزیہ انداز میں مسکرائی ہے جس میں مردانگی
رمونچھوں کو قربان کرنا پڑے یا اس نروان کے کیا معنی جس کے لیے تیاگ لازم ہو؟ یہ نظم انسانی
وجود کی اس بنیادی معنویت پر ایک مکالمے کی تحریک دیتی ہے اور یہ معمولی بات نہیں ہے!

قاسم یعقوب کی کئی دوسری نظموں میں بھی حقیقت کی قرأت کا یہی اسلوب ملتا ہے جو انھیں
نئے نظم گوؤں میں امتیازی شناخت دیتا ہے!

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

۲۵ فروری، ۲۰۱۰ء، لاہور

ریت پہ بہتا پانی

We may say that the art of a scholar is summed
up in the observance of those rejections
demanded by the nature of his medium,the
material he must use.

(Walter Pater)

The Artist may be known rather by what he
omits.

(Schiller)

ایک روشن صبح کا آغاز

سارا منظر ہی ترتیب سے میرے کمرے میں کھلنے لگا
رنگ کے دائروں میں لرزتے ہوئے سلسلے
آئینوں کے دھندلکوں میں بے معنویت کی
تفہیم ہونے لگے
سال ہا سال سے بند دروازے پر آج سورج کی دستک ہوئی
دن کے دیوں کی لویں ایک اک کر کے کمرے میں گرنے لگیں
مکڑی کی آنکھوں کے عدسوں نے
زیبائشی خلعتیں اوڑھ لیں
میں نے پوروں پہ رکھی لکیروں کے اندر جمی گرد کی تہہ کو جھاڑا
جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی حرکتوں پر جمے زنگ کی خستگی
اپنے ناخن سے چھیلی
سارا منظر ہی ترتیب سے میرے کمرے میں کھلنے لگا

میں نے بھی خود کو پاؤں پہ رکھا
جونہی گوشت کو ہڈیوں نے سنبھالا

اِک آواز نے بالکونی پہ بارش سی انگڑائی لی
اور میں خود کو گیلا سا محسوس کرتے ہوئے ہنس پڑا

زندگی ہمیں سکھاتی ہے

زندگی ذہنوں کے روزن سے نکل کے جمع ہوتی ہے
ہیولا بن کے اٹھتی ہے
سمٹتی ہے
کہیں پر سر پٹختی ہے
بکھرتی ہے
خزاں کے آخری پتے میں سمٹی زرد تنہائی کے خط و خال بنتی ہے
کہیں امواج میں تکثیریت کا روپ بھر کے
ساحلوں پہ سیپیاں چننے نکلتی ہے
زندگی رنگوں کے جل تھل دائروں میں رقص کرتی ہے
ہمیں، تختِ ہوا پہ بیٹھ کے
انگلی پکڑنے کی تمنا پھینکتی ہے
زندگی صحرا کے ٹیلوں کی طرح شکلیں بدلتی ہے

خود اپنے قاعدے ترتیب دیتی ہے
پھول کی پتی کو پوروں سے مسل کر ہم
گدازِ زندگی کا لمس لیتے ہیں
ہم اک عرصے تک اپنی ہڈیاں ہاتھوں میں رکھ کر

چاک پر آہستہ بہتے دائروں کو دیکھتے ہیں
زندگی جتنا سکھاتی ہے
ہم اُتنا سیکھتے ہیں

بدن کا نوحہ

میں نے کل ایک خواب دیکھا
کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں
میری نیند میرے جسم کے اندر رہ رہی ہے
مجھ تک منتقل نہیں ہو پا رہی
آنکھوں میں بصارت ہے
مگر مجھے دکھائی نہیں دے رہا
میں چلتا ہوں
مگر پاؤں حرکت نہیں کر پاتے
گھٹن کے مارے سانس لیتا ہوں
تو ریت منہ سے نکلتی ہے
میں خواب سے بے دار ہو جاتا ہوں

خوف کی تھکاوٹ میرے جسم سے اُترنے لگتی ہے
تو میں محسوس کرتا ہوں
میں دیواروں سے اس طرح گزر رہا ہوں
جیسے شیشے سے روشنی......

جیسے دروازے کی دَرزوں سے ہوا......

میں ہاتھ لمبے کر کے ستارے توڑ لاتا ہوں

اور پاؤں پھیلا کے زمین میں اُتر جاتا ہوں

مجھ میں یک دَم خواہش پیدا ہوتی ہے

کہ میں چیخوں

چیخنے کی اندوہ ناک کیفیت کے بوجھ تلے آ کر

میں ایک بار پھر دَب جاتا ہوں

رائیگانی کی بشارت

ہوا نے کنجِ گم گشتہ میں آ کے
میری پلکوں پر جمی ویرانیوں کی خاک کو جھاڑا
اور اپنی شبنم افشانی سے میری بانجھ پلکوں کو
گُہر باری میں بدلا
یہ سمجھتی ہے
میں اس کے ہاتھ میں انگلی تھما کر
پھر کسی نادیدہ پربت کے سفر کی ضد کروں گا
تا ابد ہمرہ پھروں گا
وقت اک ڈیسپوزیبل رشتے کی صورت ہے
جو استعمال ہوتا ہے
بسر ہوتا نہیں......

مجھے تکمیل کی سرحد پہ لا کے رائیگانی کی بشارت دی گئی ہے
میں جو ریزہ ریزہ ملبہ بنتی آبادی کا نوحہ خواں ہوں
میرے ہاتھ کی خواہش
قلم سے، پھول کی پتی بنانا چاہتی ہے......

مگر میں ملبے کی اینٹوں کی گنتی کر رہا ہوں
گھر کے ویرانے میں بیٹھا
یاد آنے والے لمحوں کو
بھلانے کے لیے دہرا رہا ہوں

چہرے کی گرد

گاڑیوں کے بہاؤ میں بہتے ہوئے شور کی گرد
میرے دھواں بنتے چہرے پہ جمنے لگی ہے
میں پہلے ہی جمتے ہوئے خون کی
گلتی سڑتی ہوئی
خواہشوں کی کراہت سے سانسوں کی قے
کرنے کی ایک سعیٔ مسلسل میں مصروف ہوں
میرا دل تتلیوں کی رفاقت کی ضد کر رہا ہے
مگر میں اسے ہڈیوں سے تنے جال سے کیسے باہر نکالوں

کڑی آزمائش ہے لیکن
چلو مسکرانے کی بے کار خواہش جگائیں
ہنسی کا پیالہ......

چلو چہرے کی جھرّیوں میں انڈیلیں
اگر ہم کسی طرح بھی ہنس نہ پائیں
تو اک دوسرے کے غلاظت بھرے چہرے کو نوچ ڈالیں
اگر ہم سے یہ بھی نہ ہو پائے تو رو ہی لیں

شاید اس طرح ہم
اپنی گالوں پہ جمتی ہوئی
گرد کی تہہ کو دھولیں

بڑھئی کی آری

کمرۂ امتحان میں کچھ چڑیاں
کمرے سے نکلنے کے لیے
دیر سے روزن ڈھونڈ رہی ہیں

درختوں سے پتے جھڑنے کی آواز
کھڑکیوں سے
آبادیوں کے قریب اُڑتے جہاز کی طرح آرہی ہے

انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لیے
بچوں کو جملہ دیا گیا ہے
"ایک بڑھئی کے پاس آری ہے"

کمرۂ امتحان میں کل اٹھارہ طالب علم ہیں
کسی کو بھی معلوم نہیں
کہ آری کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں

سارے بچوں کو پتا ہے
کہ آری سے کیا کام لیا جاتا ہے

مگر وہ یہ جملہ ترجمہ نہیں کر پائیں گے

لیموں کا پودا

یونہی ایک دن سوچتے سوچتے
میں زمانے کی بالشت بھر فکر کی گتھیوں کے دھندلکوں کی
میلوں مسافت سے تھک ہار کے
جب بدن کے خم و پیچ میں واپس آیا
تو حسیات کے ذائقے مجھ سے روٹھے ہوئے تھے
مجھے یہ خبر ہی نہیں تھی
مرے گھر کے باغیچے میں
ایک لیموں کے پودے پہ بور آ گیا ہے

ایک دیومالائی خواب سے گزرتے ہوئے

میں دیومالائی قوتوں سے ظہور میں آئے

'یانگ' اور 'ین' کو جوڑ کے اک محیطِ کُل کو بنا رہا تھا

میں ''پان گو'' کی تلاش میں تھا

جو کرۂ ارض بن کے آیا

جو چاند، سورج، ستارہ ہاتھوں سے ڈھالتا تھا

وہ جس کی سانسوں سے بادلوں کا غبار بنتا

پہاڑ کی شکل جس کے سر سے وجود میں آئی

جس کے بالوں سے جنگلوں نے خمیر حاصل کیا ہوا تھا

میں 'یانگ' اور 'ین' کی کیفیت کے علامتی دائرے میں آیا

تو 'پان گو' کا پسینہ بارش بنا ہوا تھا

نسیں بھی دریا کی شکل میں تھیں

وہ دانت اور ہڈیوں سے زیرِ زمین دھاتیں بنا رہا تھا

پھر اُس نے اپنے بدن پہ چپکے تمام کیڑے اُتار پھینکے

جو سارے انسان بن رہے تھے

میں دیومالائی خواب میں تھا

کہ میرے کاندھے پہ ارتقاء حیات کے اگلے لمحے نے اپنا ہاتھ رکھا

مجھے جگاتے ہوئے بتایا!

کہ زندگی کا غبار بھی اک طلسم ہی ہے

جو راستوں پر عمل کے قدموں کی اُڑتی مٹی سے بن رہا ہے
یہ دائرہ بھی دو رنگوں کی کیفیت ہے
جس میں سفید بھی ہے، سیاہ بھی ہے
'یا نگ' اور 'ین' سے 'پان گو' جس طرح کبھی تھا
وہ میرے بالوں پہ ہاتھ رکھ کر بتا رہا تھا
حقیقتوں میں بھی سرّیت ہے
نسوں کے دریا میں محنتیں جب لہو بہائیں
تو دیومالائی رنگ آنکھوں پہ چھانے لگتے ہیں
چاند، سورج، ستارہ جنتے ہیں

زندگی اپنا فیصلہ خود لکھے گی

ہم اپنی برہنگی چھپاتے پھرتے ہیں
ایسی حالت میں تعارُف کا فلسفہ
دیوانگی میں بڑبڑانا ہوتا ہے
بکھری چیزوں کے انبار میں
کس کس کا رتبہ یاد رکھتے
ہم نے مرضی کی ترتیب بنالی
خوشبو کا اہتمام کہاں سے کرتے
بدبو ہمیں زیادہ پر تپاکی سے ملی
ہم اپنے ہی جسموں کو چھو کر خوش ہوجانے والے
سڑاند دیتی چیزوں سے صفائی مانگ رہے ہیں
ہمارے گھروں کی چھتوں پر بے آواز بارش ہوتی ہے

ہم جھلتے کمروں میں
پانی کے خواب دیکھنے کے لیے
اپنے بستروں سے دُور جا کے سوتے ہیں
ہماری آنکھوں کے شیشوں میں نیند نہیں
موت آ کے اپنا چہرہ دیکھتی ہے
ہم وہ اُکھڑے راستے ہیں
جس کو گرد کے پہرے داروں نے ہموار نہیں ہونے دیا
ہماری طویل سرگزشت میں تکرار ہی تکرار ہے

ہمیں صرف ایک رُخ والے صفحے پر تحریر کیا گیا
جو اپنے پہلے حصے سے آملتا ہے

میں کب سے بے خال وخط پڑا ہوں

کہاں ہیں آنکھیں
میں جن میں تیرہ شبی کا تریاق

آسماں پر کھلے ستاروں میں ڈھونڈتا تھا
میں دیکھتا تھا
جو حدِّ ادراک میں نہیں تھا
جو دور ہو کر بھی میرے معروض میں کہیں تھا
میں اپنی پوروں سے پورا چہرہ ٹٹول کے خود سے پوچھتا ہوں
کہاں ہیں ہونٹوں کے سرخ کونے
کسی کے رُخسار کی اماوس کی رات میں جو
ستارہ بن کے طلوع ہوتے
جو مسکراتے، تو پھول جھڑتے

جو حرف دو حرف اِک کہانی کا ہار بنتے
جو منکشف ہو کے روشنی کا لباس ہوتے

کہاں ہے کانوں کی حیرتی کا سراب خانہ
جہاں پہ آواز
بہتے چشموں کی تازگی کا سراغ لے کر
مری سماعت کا رزق بنتی
میں کس سے پوچھوں
وہ جس سے کھلتے تھے
بارشوں میں مہکتی مٹّی کی خوشبوؤں کے

تمام مفہوم، اب کہاں ہے

میں کب سے بے خال وخط پڑا ہوں
مرا کوئی سایہ ہی نہیں ہے
سب آئینے جھوٹ بولتے ہیں
کسی کے چہرے کو میرا چہرہ دکھا رہے ہیں

برگد سے واپسی

وہ بچی گم شدہ حیرت سے آثار قدیمہ والا صفحہ کھول کر
اسکول کی بک پڑھ رہی ہے

اُسے معلوم ہی کب ہے
جسے نروان ملتا ہے
وہ صدیاں اُوڑھ کر صفحوں میں بدھا بن کے رہتا ہے
وہ پڑھتے پڑھتے جب تصویر پر نظریں جماتی ہے
تو اُس کو، آنکھ کے حلقوں میں مردہ خواہشوں کی زردیاں محسوس ہوتی ہیں
گھنے برگد کے سائے میں پڑے رہنے سے
اُس کی گال پہ سورج کا بوسا ہی نہیں ہے
اُس کے سر کے بال کی سب تازگی جنگل کے سبزے میں پڑی ہے

اُسے بدھا پہ رحم آیا
وہ بچی ہاتھ میں پنسل پکڑ کر سوچتی ہے
اور پھر تصویر کے اُوپر
لکیریں کھینچ کر مونچھیں بناتی ہے
اور اس تبدیلی سے اندر ہی اندر مسکراتی ہے
کہ جیسے اس نے دانش کی سبھی کمزوریاں
اپنی لکیروں سے چھپا دی ہیں
اُسے معلوم ہی کب ہے
کہ اُس کے ہاتھ کی جنبش نے اندر کی
سبھی آلائشیں چہرے پہ رکھ دی ہیں
وہ جن کو جسم سے آزاد کر کے ایک عرصے سے تیاگ گیا تھا

اب آثارِ قدیمہ والے صفحے پر 'دنایا' اور 'ستا' کے کوئی مفہوم ہی باقی نہیں ہیں
ذرا مونچھیں بنانے سے سبھی دکھ مٹ گئے ہیں
'مارگ' کی کوئی ضرورت ہی نہیں
بدھا کپل وستو کا شہزادہ دوبارہ بن گیا ہے

نیم □ خوابی سے خواب تک

وہ جگنو جو گزرتے پل کی مٹھی میں مقید تھا
اُڑا......

اور ایک ایسی سلطنت کے قید خانوں کی اسیری پا گیا
جو تمھارے ہاتھ کی ترچھی لکیروں کا احاطہ ہے
وہ کیسا ائر مدی لمحہ تھا
جب تم نے ہتھیلی بھینچ کر اِس روشنی کو
ایک لافانی تسلسل بخش رکھا تھا
وقت کے محتاط پانی نے یکا یک سیپیوں کی ایک چادر
سامنے پھیلا دی

اور پھر تم نے اپنے ہاتھ پر رکھی ہوئی
اُس روشنی کی رہنمائی میں
مجھے گھونگے اُٹھانے کا کہا تھا
میں مالا مال ہوتا جا رہا تھا
یکا یک آنکھ کے دروازے پر سورج نے دستک دی
ہوا کے ہاتھ نے پلکوں کا دروازہ جو کھولا
تو میں اک اور ہی منظر میں تھا
وہ جگنو میری اپنی ذات میں تھا
تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا

موت کے لیے ایک نظم

(چوک پل منڈی، مینا بازار پشاور میں مرنے والی عورتوں کے نام)

میں اب مرنا چاہتا ہوں

مرتے وقت

اور مرے ہوئے

میں اُن قدروں کی پامالی کا تجربہ اُدھار لوں گا
زندگی جن کے لیے مجھے شرمسار کرتی رہی
موت روزانہ میرے سامنے
ایک اندوہ کیفیت میں ڈھلتی ہے
میں اس کی شدت کا رس چکھنے سے محروم رہتا ہوں

میں مر کے، پھر زندہ ہونا چاہتا ہوں
زندگی کو اُس احساس کا نغمہ دینے کے لیے......
میرے آنسو
جس کی نمکینی کی لذّت
اپنے اندر گھولنے کی حسرت میں
خودکشی کرتے پکڑے جاتے تھے

اپنے جیسے ایک دوست کے لیے

(زاہد امروز کے نام)

اپنے ریتلے خوابوں کو لے کر
اِمکانات کی بارش میں نہاؤ
شاید تم ایسے اپنی سیرابی کی خواہش پوری کرلو
اور اگر تم کرلو

تو میری کھنڈر آنکھوں میں شادابی کی قلم لگانا
جو اِس خواہش میں ریزہ ریزہ
ویرانی کا رزق ہُوئی ہیں

اپنی آنکھیں مٹھی میں رکھ کر
اپنے آگے کھلے رستے پر زور سے پھینکو
شاید تم ایسے حدِ نظر سے آگے دیکھ سکو
اور اگر تم دیکھ سکو
تو پھر میرے لیے بھی لے آنا
نظّارے کی کچھ بوندیں
ایسی ہی کوشش میں، میں بھی
اک عرصے سے نابینا ہوں

مجھے کچھ پوچھنا ہے

اپنے آگے پیچھے دوڑتے
اور کچھ ایک جگہ پر رُکے ہوئے چہروں سے
یا پھر اپنے آپ سے

مجھے کچھ پوچھنا ہے
شاخ سے جھڑتے پتّوں سے
پتّوں پر پڑے ہوئے
کچھ خون کے گہرے گہرے چھینٹوں سے

دھوپ میں کھلے ہوئے پھولوں سے
پتّیوں کے اُڑے ہوئے رنگوں سے

کھمبے پر اَڑی پتنگوں سے
ٹوٹے چند پروں سے

مجھے کچھ دیکھنا ہے
تارکول کی ناہموار سڑک پر
تھوک اور مکھیوں کے ہمراہ
اپنی مٹّی کی رنگت
قدموں سے
بازو پھیلا کے
اور کبھی بالشتوں سے ماپ کے
اپنے حصے کی وسعت

بوڑھا وقت تمہارا استقبال کرتا ہے

عرشہ ءخاک سے، میں نے ہاتھوں میں مٹی بھری
اور ہوا میں اُچھالی
بہت دور تک خاک اڑتی گئی
دیر تک میں نے بے معنی نظارے کو کائناتی حوالوں سے ماپا
کبھی طول اور عرض میں اِس کو رکھا
اُبھرے پپوٹوں،
کبھی بند آنکھوں سے دیکھا!
وہ سوچا جو دیکھا نہیں جا سکا!
ہوا خاک تھی یا ہوا میں تھی خاک......!
گرد کی مٹھیوں سے ہوا چھن رہی تھی

عرشہء خاک کی گود...... پھر بھر رہی تھی

آب وقت آسماں کی طرف بڑھنے کی کوششوں میں
زمیں کے پیالے میں گرتا گیا
کوئی آہستہ سے بوڑھا ہوتا گیا
سوچتے سوچتے
کپکپی سی مرے ہونٹوں کے نقرئی دائروں میں اُترتی گئی
اُمر بیل کی طرح ہاتھوں سے رعشہ لپٹنے لگا
رفتہ رفتہ...... سمٹنے لگے...... عرشہء خاک پر
منتشر گرد، میں اور ہوا

تخلیق نروان دیتی ہے!

اے لڑکی!
جھیل کے آبِ ساکت میں پاؤں کی
آہستہ ضربوں سے لہروں کو درد آشنا کرنے والی!
اے لڑکی!
تری آنکھ صدیوں کی محرومیاں اُوڑھ کے مجھ سے یہ جاننا چاہتی ہے
کہ میں کون ہوں!

میں وہ تو نہیں ہوں
جو ماضی کے آسیب خانوں کے جالوں میں
لہروں کا موجب بنا آرہا ہے

میں وہ بھی نہیں

جو ترے جسم کے آئینے میں بھٹکتا ہوا
تیری آنکھوں پر اب ہاتھ رکھے ہوئے ہے

اے لڑکی!!
میں وہ ہوں
جو آئندہ کی جھیل میں تیرے ڈوبے ہوئے پاؤں کے
مستقِل درد کو جانتا ہے
جو لہروں میں اُترے ہوئے خواب گوں لمس کو
رازِ تخلیق پہچانتا ہے

کچی عمر کا لڑکا

(۱)

کچی عمر میں
لڑکی کو خط لکھنے والے لڑکے!
تم اس کے بارے میں اِس وقت
اُس کے خدا سے زیادہ جانتے ہو!

(۲)

بارش کی آواز میں
اک لڑکی کی یاد میں روتا
کچی عمر کا لڑکا
جنت کے فرشتوں سے پاکیزہ ہے

(۳)

اک لڑکی کی یاد میں روتا دیکھ کے،
کچی عمر کے لڑکے کی آنکھیں
اُس سے پہلے رونے لگیں

(۴)

لیموں کے پودے کی خوشبو
کچی عمر کے لڑکے کے بالوں کا بوسہ لے کر
ہر بار اس لڑکی کے جسم پہ آ کے
مر جاتی ہے

(۵)

کچی عمر کا لڑکا
خواب میں اِک لڑکی سے ناراض ہوا تھا
چاند بتاتا ہے
ساری رات وہ لڑکی روتی رہی
اور دور پہاڑوں پر
بارش ہوتی رہی

(۶)

سرخ گلابوں کی کیاری کے پاس کھڑی
اک بوڑھی لڑکی
کچی عمر کے لڑکے کی آنکھوں سے
اپنے خواب محل کا رستہ پوچھ رہی ہے

ہم ریت کے گھروں میں رہتے ہیں

میں بھی نادان ہوں
پاؤں پر ریت کا گھر بنانے میں مصروف ہوں
جس کی دیواریں چھت کے سہارے پہ ہیں
اور چھت کا سہارا بتانے سے ڈر لگ رہا ہے
میں بھی نادان ہوں
گھر بنانے کی بے معنی خواہش میں
زندہ حوالوں کی تفہیم کرنا نہیں چاہتا
نہ اس گھر میں دروازہ کوئی
نہ کھڑکی، نہ روزن!
نہ آنگن میں بیلوں کی بل کھاتی شاخوں کا سبزہ
سرِ شام جن پر ستاروں کی قطروں میں گرتی ہوئی روشنی کی چمک

نہ کمروں کی حد بندی کوئی

جہاں خواب بُنتی ہوئی آنکھ کو سانس لینے کی کوئی سہولت ملے
کسی طاق میں کوئی جلتا دیا ہے
نہ گل دان میں پھول کی کوئی خوش بو
ستارے سرِ عرش بچوں کی شفاف آنکھیں بنے ہیں
مگر خاکہ نقشِ پا سے، سرِ فرش محروم ہے
یہاں پر ہواؤں کی طغیانیوں کی کوئی پیش بندی نہیں
موسمی جزرومد کے بہانے سے آتی ہوئی بارشیں
ہاتھ سے کس طرح رُک سکیں
اس کی تعمیر و تخلیق میری ہے
لیکن وراثت کے دعوے کا مجھ کو کوئی حق نہیں

کتنا نادان ہوں
پاؤں پر ریت کا گھر بناتے ہوئے
ہاتھ کی تھاپ سے اس کو مضبوط کرنے کی کوشش میں ہوں
جانتے بوجھتے اپنے دھوکے میں ہوں

میں نظم لکھتا ہوں!

میں جب تخلیق کا جگنو پکڑتا ہوں
مرے اندر اندھیرے میں
گندھی مٹی کا پانی
روشنی کی بوند کی خواہش جگاتا ہے
کیمیائی خواب کتنے اہتمام انگیز ہوتے ہیں
بھٹکتی خوشبوؤں کو جمع کرتے ہیں
پہاڑوں پر پڑی بینائیوں کی وسعتوں کو
جوڑ کر ترتیب سے رکھتے ہیں
اور آنکھیں بناتے ہیں

پھر ان میں آنسوؤں کی فصل اُگاتے ہیں

مجھے بارش بتاتی ہے
کہ ماتھے سے پسینہ بہہ رہا ہے
تھوک منہ بھر کے نگلنے سے
اپاہج حرکتوں کا زنگ اُترتا ہے
اذیت سہنے کی لذت مرے اندر اُترتی ہے
میں بستر پر سکڑتا ہوں
نئی اک نظم لکھتا ہوں

پانی کا نغمہ

(نصرت فتح علی خان کے لیے)

میں پانی میں بکھرے ہوئے
چند اوراق کے بکھرے لفظوں کی تحریر
پڑھتے ہوئے خود کو پانی میں محسوس کرنے لگا
لفظ اک دُھن میں بہتے ہوئے
میرے اشکوں کے زینے سے نیچے اُترتے رہے
نغمۂ خواب کی تتلیاں
نخلِ زارابد پر اُترتی
اور اُڑتی رہیں

کوئی پانی کی لہروں کے آہنگ میں تیرتا گیت
میرے لبوں سے لپٹنے لگا

اور پھر چند لمحوں میں پانی کی تحریر مٹنے لگی
ایک آہنگ سا لہروں میں تیرتا رہ گیا
گیت لفظوں کی مالا پہن کے کہیں کھو گیا
سنا ہے اُسے
جھیل کی چھت پہ نغمہ سرا، کچھ پرندے بلا لے گئے ہیں

آنکھوں کو مرضی سے دیکھنے دو

زندگی کتنی خوبصورت ہے
گلی میں کھیلتے بچے کی
پھٹی ہوئی سرخ گالوں کی طرح

دھوپ کی بارش

چاند کیمیا گر ہے
روشنی بناتا ہے
روشنی کے روزن سے
زندگی دکھاتا ہے

چاند کو نہیں معلوم!
شہر کے مکینوں کے
آنسوؤں کی تلچھٹ سے
زندگی کی مٹی کو
گوندھ کر کوئی کیسے
چاک پر سجاتا ہے!
رتجگے زمانوں کے
کوئی اپنی آنکھوں میں
کیسے آزماتا ہے!

ہم نے فرش کے بستر

پتھروں کے تکیوں اور
اِک دِیا سلائی کے
حوصلے پہ رات، اپنے
شہر میں اُتاری ہے
روشنی کی اشرفیاں
اُس زمیں کا مدفن ہیں
جس کی خاک پر ہم نے
عمر اِک گزاری ہے

چاند کیمیا گر ہے
کیمیا گری میں آج
روشنی کے روزن سے
پھینک دے اگر سورج!
اور دھوپ کی بارش
کھڑکیوں مکانوں میں
راستوں ، دکانوں میں
بوند بوند اُتر آئے!
روشنی کی اشرفیاں
جھولی جھولی بھر جائے!

خواب کدوں سے واپسی

اے میرے بدن سے لپٹی ہجرت کی سرشاری!
خواہش کی بے سمت جہت کے کہنے میں مت آ
میرے بازوؤں میں قوت تو ہے
جو سوکھے سمندر میں تیرتی کشتی کے پتوار میں اُتری ہے
لیکن میری ٹانگوں میں
حرکت کے کوڈز مسلسل مرتے جاتے ہیں

گونج ایک بہاؤ میں میری جانب بڑھتی ہے
اور خاموشی......
چہرے کے خال وخط سے نوچ کے لے جاتی ہے

میں رفتہ رفتہ
خواہش کے انبار میں گرتا جاتا ہوں
نیند کی طغیانی میں بہتا جاتا ہوں
پھر صحن کے نل سے بہتے پانی کی آواز
مرے رستے پر
سرگوشی پھینک کے جاتی ہے
مجھ کو خواب کدوں کی حیرت سے واپس لے آتی ہے

بارُود کی بُو

(بے نام جنگ میں مرنے والے بے نام لوگوں کے نام)

اُن کو دل اور درد سے نسبت نہیں ہے
سرحدوں کی فتح کا نشہ
دماغ اور میز کے نقشوں میں یکساں ہے
کبھی تیغ نیام انساں کا وَرثہ سمجھی جاتی تھی
آج انسانی اَثاثہ، ہاتھ میں بندوق ہے
زخم ژولیدہ کے رِستے خون میں بارُود کی بُو کا ذائقہ
تہذیب کے تبدیل ہونے کا اشارہ ہے

سرحدوں کی فتح کا نشہ
پہاڑوں سے نکلتے سرخ لاوے کی طرح

آبادیوں میں آ رہا ہے
اپنا ٹی وی بند کر دو
ننھے بچوں کو یہاں سے دور لے جاؤ
اور اُن کے ذہن سے اُٹھتے سوالوں کو کسی دیوار میں
میخیں لگا کر گاڑ دو............
برف کے بانوں سے مظلومی کو کیسے ماپ سکتے ہیں
اُنہیں سمجھانا مشکل ہے
کبھی بارود کی آنکھیں نہیں ہوتیں
اور اب بارود استعمال کرنے والا بھی آنکھیں نہیں رکھتا

کبھی کبھی جی کرتا ہے۔۱

دور فلک تک اُڑتا جاؤں
چاند کی دودھیا بھیڑ کو ذبح کر آؤں
اپنے ناخن کی دھار سے گھنے پہاڑوں کو چیر آؤں
اِتنی زور سے چیخوں
ساری خوشبودار ہوائیں
دور تلک لُڑھکیں
اور مر جائیں

کبھی کبھی جی کرتا ہے
خاموش رہوں
اپنے باطن کی تنہائی میں آ کر
چپکے سے دو آنسو رو لوں

مرے لیمپ کی روشنی پوچھتی ہے

(۱۸ اکتوبر، ۲۰۰۵ء کے ہولناک زلزے کی یاد میں)

مرے لیمپ کی روشنی ڈھونڈتی ہے
کہ اُس کوز میں میں چھپے گردشی دائرے کا پتہ مل سکے
اس سے مل کر اسے چند باتیں کہے
یہ وہی دائرہ ہے جسے نیند نے
اپنے ملبے میں مدفون رکھا ہوا تھا
جانے کیوں اس کو اِتنا چھپا کے
زمیں کے خزانوں کے خواب گراں میں اُتارا گیا

مرے لیمپ کی روشنی پوچھتی ہے
اِسے کس نے حرکت عطا کی
وہ جس نے اِسے انتشار و تغیر کا ملبوس پہنا دیا ہے

وہ جس نے بھی زیرِ زمیں دائرہ زلزلہ کر دیا ہے
اگر اُس کو فرصت ملے تو میں بچوں کی گالوں پہ
جمتے ہوئے خون کے چند چھینٹے دکھاؤں
میں اُس کو بتاؤں
جو چھاؤں کی تعلیم دیتا رہا
اُس اسکول کی چھت کے سائے سے سورج نکل آیا ہے
وہ اک لمحہ شہروں کے ملبہ بنے
منظروں میں پھنسے
بے گھروں کے لہو کی
ذرا کچی بُو سونگھ کر اُن کے چہرے پڑھے
کچھ کہے......
یا مرے لیمپ کی روشنی کی سنے!

ہم خوش قسمت ہیں!

(عزیز دوست عامر مشتاق کے نام)

(۱)

زندگی مجھے ترتیب دینے کے لیے
دریا کے نیند بھرے پانی میں
خواب کی طرح پھینک آتی ہے
ہوا کے ہاتھ سے لہریں
کتاب کے صفحوں کی طرح کھلتی جاتی ہیں
میں کسی دن ساحل کو الوداع کہتی ہوئی سیپی میں
خود کو آشکار کرتا ہوں
مجھے کوئی بتانے لگتا ہے
سردیوں کے موسم میں

ناشپاتی کی سبز ٹہنی کا
دھوپ سے کیا رشتہ ہے!
میں انکشاف کے وجد میں
چاند سے باتیں کرنے لگتا ہوں
جو کھڑکی سے کود کر
میرے گل دان کو بھرنے لگتا ہے
میں اُس کی باتیں سنتے
گھنٹوں روتا رہتا ہوں

(۲)

میں جس شہر میں رہتا ہوں
وہاں انسانوں کے پاؤں نہیں، پہیے ہوتے ہیں
یہاں کوئی راستہ واپس نہیں لوٹتا
روزانہ لوگ صبح سویرے
دن اپنے گھروں سے لے کر نکلتے ہیں
لیکن رات کے دروازے پہ پڑی نیندیں
کسی دوسرے گھر سے چنتے ہیں
کہیں منادی ہو رہی ہے
کہ سڑکیں ہماری چھتوں پہ بنائی جائیں گی

شہر کی کشادگی میں
اب ہمیں گھر بھی
پلوں کے نیچے میسر ہوں گے

تمھاری بیٹھک کا دروازہ
گلی کی بجائے
گھر کے صحن میں کھلتا ہے
ہم خوش قسمت ہیں
تمھارے ساتھ بیٹھ کر
قہقہوں کا نشہ کر لیتے ہیں
جس کی پابندی پر
تھانے کے سارے سپاہی نکلے ہوئے ہیں

ہوا میں تیرتے پَروں کے خواب

یہ بکھرا بکھرا سا منظر
آؤ مِل کے جوڑتے ہیں

گھنے پہاڑوں سے واپس
سورج کا رخ موڑتے ہیں

شام کی ڈھلوانوں سے گرتے
سبز پرندے روکتے ہیں

آؤ جنگل کو چلتے ہیں

اس گھر سے بادل بولتے ہیں

گھونسلے میں بیٹھی خوشبو کو
ہوا پہنا کے چھوڑتے ہیں

پھول بہا کے دریا سے
دیر تک اس کو دیکھتے ہیں

ٹھنڈے جھونکے لے جا کے
کھیتوں کے اکھوے کھولتے ہیں

دیر تک اس ویران سڑک پر
چلتے ہیں، کچھ سوچتے ہیں

کبھی کبھی جی کرتا ہے۔ ۲

کبھی کبھی جی کرتا ہے
میں جیسے لیکچر کے آغاز سے پہلے
روسٹرم بجا کے طلبہ کو خاموش کراتا ہوں
کبھی ایسے ہی
شہر کی سب سے اونچی بلڈنگ پہ جا کے
چھڑی بجا کے
آوازہ لگاؤں
"بس اب
حبس زدہ موسم میں

تازہ ہوا کو
سبز رتوں کی شاخوں سے زیادہ دور نہ رکھو

اک دوسرے کے آنسو پونچھو
کھل کے ہنسو
چلو اپنی اپنی بکس ذرا کھولو"

فارم ہاؤس کی تنہائی میں ایک دن

جب میں وہاں پہنچا تھا
آواز کے ایندھن پر
اُکھڑے سانس کی پھونک گری تھی
میں ٹوٹتا جڑتا کمرے کے چوکھٹے میں پہنچا تھا
اِک بستر کی گہری سِلوٹ میں خودکو رکھ کر
آنکھوں کا دروازہ اُوڑھ کے لیٹ گیا
کھڑکی سے تازگی
اپنا جسم ہوا پہ رکھ کے لائی تھی
نیچے اُتری......!
اور مرے خط وخال کی ناہموار جگہ پر تیری

میں نے اُٹھ کے اپنے بازو
اپنے بدن سے علاحدہ کئے
اور آتش دان کے پہلو میں پڑے اِک میز پہ رکھے

پھر کچھ سوچ کے
اپنی ٹانگیں بستر پہ پڑے کمبل کی
نرم تہوں میں چھپادیں
اس بے چینی میں اپنا باقی ماندہ جسم اُٹھا کے
کھلی فضا میں لے آیا
دیر تک ایک اُداسی مجھ سے باتیں کرتی رہی
پھولوں کی روشنی سے گھبرا کے واپس کمرے میں آیا تو دیکھا
بازو کتابیں ہاتھ میں پکڑے
شیلف کے آگے کھڑے تھے
اک کونے میں پڑی آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے تھے
کھڑکی سے رستا منظر
دیواروں پہ جم سا گیا تھا
اور ٹانگیں انگڑائی لیتی
کمبل سے باہر اپنے پاؤں بھول گئیں تھیں
کمرے میں اندھیرا چھانے لگا تھا

میں نے گھبرا کے سب چیزوں کو
اپنے آپ سے جوڑا
گاڑی میں بیٹھا
اور شام ڈھلے گھر آ پہنچا

مجھے اب تمھاری ضرورت پڑی ہے

کہاں ہو!
مرے پاس آؤ
مری آنکھ پر ہاتھ رکھ کر
مجھے خواب گاہِ حقیقت سے باہر نکالو
میری بینائی کو اپنے ہاتھوں پہ رکھی لکیروں میں بہہ جانے دو
مرا جسم اک طرف بے کار ذرّات کا ڈھیر ہونے چلا ہے
مگر دوسری سمت طغیانیاں خون میں موجزن ہیں

کہاں ہو!
مجھے اب تمھاری ضرورت پڑی ہے

میں جینے کی خواہش میں مرنے کو تیار ہوں
فیصلہ کرنے کی مجھ میں ہمّت نہیں ہے
میں کس نظریے کی مدد لوں
یہاں فکر کے سایے اپنے ہی قد سے بڑے ہیں

اپنی ڈھلوان پر خود سے بے قابو ہو کر چلے جا رہے ہیں
میرے گھٹنوں میں حرکت کی نم دراِلیسیں نہیں ہیں
میں اپنی ہی تہذیب کے قلعے میں بند ہوں
جہاں دن کا سورج مرے واسطے روشنی پھینکتا ہے
مگر آنکھ کی دُور بیں کچھ بھی چننے سے محروم ہے
مراذائچہ کھینچ کر میرا اطراف سے کوئی رشتہ نکالو
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر
خدارا بچالو!

اب جو خط لکھنا!

اب جو خط لکھنا
تو اُس کے ساتھ ہی بینائی کی لَو بھی بھیجنا مجھ کو
میرے دل میں
تمہارے لکھے حرف
تمہاری آنکھ سے پڑھنے کی خواہش جاگ اُٹھی ہے

ایک کتبے کی تلاش میں

ہواؤں کے تعاقب میں
میں اک تتلی سے ٹکرا کے زمیں پر گر پڑا ہوں
پروں کی گدگداہٹ سے
مرے ماتھے سے خوں بہنے لگا ہے

مجھے یکسانیت سے خوف آتا ہے
زیادہ دیر اک ہی کیفیت میں زندہ رہنا کتنا مشکل ہے
پرانے موسموں کی نوحہ خوانی میں
نئے موسم کی خواہش پیدا ہوتی ہے
میں اپنے حلق کے اندر کنواں تعمیر کرتا ہوں

میں اُڑ سکتا ہوں
لیکن میری بے تابی کو جانے کون سی موجِ ہوا
آغوش میں لے گی
میں تھک کے بیٹھ سکتا ہوں
مگر ساری زمیں میرے لیے اوندھی پڑی ہے

مری سوچوں کے مرکز سے نکلتے راستوں پر
میرے نقشِ پا کے بے ترتیب خاکوں میں
اب آنکھیں اگ گئیں ہیں
ہوا کے ہاتھ میں اک لوح میرا خواب نامہ ہے
ہواؤں کے تعاقب میں اگر میں مر گیا
تو کون میری لحد پر اس لوح کو کتبہ بنائے گا

تمہارے لیے اعترافِ شکست

تم نہر کا وہ پانی ہو
جو کنارے پر آ کر اپنے پانی سے بچھڑ جاتا ہے
مٹی کے کیچڑ اور جھکی ہوئی شاخوں کے لیے
وہیں رہ جاتا ہے
مجھے خبر ہے
تمھارا غم، میرے دکھوں سے افضل ہے
تم وہ گھاس ہو
جس نے گیلی مٹی کی خوشبو کو
اپنے وجود کے سبزے میں بھرا ہوا ہے
تمھارے جذبے تمھیں اندر سے گُندھے ہوئے ملتے ہیں
خواب تمھیں دیکھتے ہیں
تم اُن کی تعبیر کی فصل پہ بارش بنتے ہو

میرے جسم پہ چوٹ داغ اگاتی ہے
مگر تمھارے اندر آنسوؤں کے ننھے ننھے پھول
اپنی نوزائیدہ آنکھیں کھولنے لگتے ہیں
میں روتا ہوں تو ناراض ہو جاتا ہوں
تم روتے ہو تو
اُداس ہو جاتے ہو

وہ جلدی میں تھا

(اپنے ریٹائرڈ ریلوے آفیسر ماموں کے نام جو ٹرین کی زد میں آگئے)

وہ جب دنیا میں آیا تھا
تو اک بے نقش ہاتھوں والا انساں تھا
وہ خود حیران تھا
جلدی میں وہ اپنی لکیریں بھول آیا ہے؟
اسے پہچان کی آخر ضرورت تھی
لہٰذا اس کو اپنا جوتشی بننا پڑا
اک دن وہ بے دھیانی میں ہاتھوں میں لکیریں رکھ رہا تھا
مگر اس کی شعوری کوششوں میں لاشعوری ہو رہا تھا
میں نے اس کے ہاتھ سے باتوں میں پوچھا!

''تمہاری دو لکیریں مستطیلی کیوں ہیں؟
جیسے ریل کی پٹڑی بچھی ہو''
میرے استفسار پر خاموش تھا
جیسے وہ خود اس واہمے میں ہو
اسے تبدیل کرنا چاہتا ہو
مجھے اس کا جواب اک ریل کی پٹڑی کے پہلو میں ملا
جہاں وہ خون میں لت پت پڑا تھا

نہ اس کی آنکھ بدلی تھی
نہ اس کے جسم میں خم تھا
مگر اب ہاتھ کی دونوں لکیریں مل گئی تھیں

ایک انقلابی کی موت

مری پیاس کو چند قطرے ہی کافی تھے
لیکن سمندر کا پانی تو نمکین تھا
اور میرے بدن میں کثافت تو پہلے ہی موجود تھی
آنت در آنت جو سانس روکے کھڑی تھی
مرے بازوؤں میں وہ حرکت بھی باقی نہیں تھی
جو پتوار کو منتقل ہو سکے
میری کشتی ذرا جس سے آگے چلے
مرے جسم کو ڈھانپنے والے کپڑے بھی آدھے ہوئے جا رہے تھے
سر پہ سورج کی کرنیں بھی اب قوس بننے لگی تھیں
اور خشکی (جو اس تر نظارے کی ضد ہو) کا کوئی
نشاں دور تک بھی نہیں تھا

میں ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا
مگر اپنی بے دست و پائی کا اندازہ کرنے سے
بے خم ارادوں کو خم دار ہونے سے کیسے بچاتا؟
کہاں بھاگ جاتا
دور تک پھیلے پانی کی یکسانیت میں
مجھے تیرتا ایک پتا نظر آیا
جو چھاؤں دیتے شجر کے تصور میں ملبوس تھا
جونہی اس کو پکڑا

تو اک تیز ریلے کی شدت سے غرقاب تھا

میں تہہِ آب تھا

کئی روز طغیانیوں کے نشیبوں، فرازوں سے ہوتا ہوا

ایک دن مردہ حالت میں ساحل پہ پایا گیا

مرے ہاتھ میں ایک پتا تھا

اور منہ میں نمکین پانی

شہر اپنا نوحہ پڑھتا ہے

واقعہ بہت عرصے بعد المیہ بنتا ہے

چوٹیں دیر بعد دکھ بنتی ہیں

خون ہمارا قومی رنگ بن گیا ہے
خوف کا چہرہ
گرمیوں کے سورج کی طرح ہر گھر سے دیکھا جا سکتا ہے
قریب رہنے کی خواہش میں، ہم نے
باورچی خانہ اور بستر ایک ہی جگہ بنا رکھے ہیں
بچوں کو اسکول جانے کی ضرورت نہیں
ان کی آنکھوں میں روزانہ نئی تحریر لکھ دی جاتی ہے
ماؤں نے کھڑکیاں بند کر دی ہیں
اور روزنوں پر اخبار چڑھا دیے ہیں

روزانہ شہر کی نوزائیدہ ہوا
بندوق کی نالی سے گزر کر
اپنی پیدائش کا اعلان کرتی ہے

پھر وقت بدل گیا

وہ ہر روز گملے میں مجبور پودے کا قد ماپتی تھی
وہ روزانہ مجھ کو
کسی شاخ پر تازہ بکھری ہوئی
وقت کی نرم قاشیں دکھاتی
انھیں ہاتھ پر رکھ کے لاتی

میں ہر رات صحنِ تخیل میں بکھرے ستاروں کے
خط کھول کے
میٹھے لہجے میں اس کو سناتا
اسے نیل گوں آب کے جھلملاتے ہوئے
عکس میں وقت بہتا دکھاتا

ہم اک دوسرے کے لیے
خواب گاہوں میں پتھر کی صورت پڑے تھے
پرانے صحیفوں کے صفحے ہمیں پڑھ رہے تھے
مگر آج جیسے ہی صدیوں سے ٹھہری مری عمر میں
ایک لمحہ اضافہ ہوا
تو مری آنکھ کے دائروں میں کھلے راستوں پر
بڑھاپے کی گرد اُس کو بے آب منظر دکھانے لگی
دشت میں تیز چلتی ہواؤں کی آواز آنے لگی

بے بسی ٹھہرے پانی میں کشتی چلاتی رہی
ایک لمحے میں
خوابوں کا خوں دیکھنے والی لڑکی
زمانوں تک آنسو بہاتی رہی

میرے اندر

مرے آگے پیچھے بھی میں ہوں

زمانوں کے سایوں کی وسعت سمیٹے

مرا دائرہ اپنے امکان کی حد پہ نوحہ کناں ہے

جہاں دھند کے ساتھ بہتی ہوئی موت

اب ایک جنگل بنائے کھڑی ہے

مری آنکھ میں منجمد خوف تحلیل ہونے کو تیار ہے

یہ وہ لمحہ ہے

جس کی گواہی کی تمکین میرا حلالِ بدن ہے

مگر کیا یہ میرے لیے ہے؟

کسی اور کی آنکھ میں خوف تحلیل ہونے کو تیار بھی ہے؟

میرے اندر

مرے آگے پیچھے کوئی اور بھی ہے؟

جہاں میں کھڑا ہوں

وہاں موت کی انگلیاں جنگلی خوف بُننے میں مصروف ہیں

یہاں سے بہت دور

اِک نیل گوں جھیل میں تیرتی مچھلیاں

اپنی آنکھوں کی حیرانیاں
صاف، شفاف پانی میں یوں گھولتی ہیں
مرے ہونٹ جیسے کسی جسم کے آئینے کے تحیّر کو توڑیں
وہاں کوئی تازہ ہواؤں کے دریا میں
تیراک ہونے کی خواہش جگاتا ہے
لیکن جہاں میں کھڑا ہوں
وہاں زندگی ڈھونڈنے کی مشقّت (مشیّت)
ہمیں زندہ رہنے پہ مجبور تو کر رہی ہے
مگر آسمانوں پہ نظریں جمائے ہوئے
ہم کو پتھر چبانے کا عادی بنائے ہوئے

میں کچھ لکھنا چاہتا تھا!

میں کچھ لکھنا چاہتا تھا
دھوپ بدن پہ پہنے
ایک شجر کو میری حالت پہ رحم آیا
اس نے مجھے
اک ٹہنی کے اندر
ملفوف قلم کا بتایا
میں ناخن سے چھیلتا،
ریشے کاٹتا، چیرتا
شاخوں کے اندر تک جا پہنچا

اور برسوں ٹہنوں، پتّوں میں پھرتا رہا
تب اک دن، ایک ہیولا
بنتے بگڑتے، اور نمایاں ہوتے
بیج کی شکل سے میرے پاس قلم بن کر پہنچا
میں نے اس کو رواں کرنے کے بہانے
سب سے پہلے
کچّے پکّے کچھ لفظوں سے
تیرے نام محبّت کا اک خط لکھا

دھبے پڑنے اور ادھورے لفظوں کے باعث
بعد میں اس کو پھاڑ دیا

مجھے ابھی معلوم پڑا ہے
اس بوڑھے شجر کو
ایک سڑک کی راہ میں حائل ہو جانے سے
کارپوریشن والے کاٹ گئے ہیں

نئے موسم کی عزاداری

آنکھ سے اشکوں کو اپنے غم میں بہنا چاہیے
ایک دن سب سے الگ ہو کر بھی رہنا چاہیے
ضبط سے آزاد کر کے زیر و بم آواز کا
سامنے سب کے، جو دل میں آئے کہنا چاہیے
ریت کے ٹیلے چلیں لہرِ سمندر پر کبھی
سطحِ صحرا پر کبھی دریا کو بہنا چاہیے
میرا ہر طرزِ عمل میرا الگ کردار ہے
اپنے اندر جا کے ان لوگوں میں رہنا چاہیے

میں خوش رہتا ہوں

میں خوش ہوں
نامکمل ہو کے پوری زندگی کے ذائقے محسوس کرتا ہوں
نیند میری خواب گہ کے صدر دروازے پہ پہرے دار ہے
میں آنکھیں بند کرتے ہی
بدن کی تیرگی میں مشعلیں لے کر نکلتا ہوں
پسینے کا بہاؤ جسم سے رستہ بناتی خواہشوں کو ماپتا ہے
خون کی یخ بستگی کو تھاپتا ہے

میں چلتا ہوں تو اک ویراں سڑک ہم راہ چلتی ہے
میں اپنی مٹھیوں سے رونقیں آبادیوں میں پھینکتا ہوں
راستوں سے گرد اڑ کر رقص کرتی ہے

میں خوش رہتا ہوں
اپنے ہاتھ کو کنگھی بناتا ہوں
یہاں تو وہ بھی ہیں
جو چہرے پر خط رکھ کے
اپنی ران کے بال اُستروں سے کاٹ کر فیشن بناتے ہیں
زبانیں تھوک سے گیلی تو رکھتے ہیں
مگر سینے میں صحرا ریت اُڑاتا ہے

خدا کا شکر ہے

خوش باش رہتا ہوں

میں اپنے آنسوؤں کے ڈوبنے سے ڈرتا رہتا ہے

تم کتنی اچھی ہو!

تم کتنی اچھی ہو!

تمہاری گالوں کی شمعوں کو جب میں اپنی پوروں سے چھوتا ہوں
تو میری بینائی کے تاریک کدوں کو روشنی ملتی ہے
تمہارے بالوں کے جنگل میں
میری انگلیاں رستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے
زندگی پا لیتی ہیں
تمھارے چہرے کے خال وخط میں
اجلی خوبانی کی ڈھلوانوں جیسی قوسیں ہیں
تمہاری آنکھوں کا اجلا پن
ٹہنی پر تازہ پتے کی پیدائش سے کتنا ملتا ہے

تمہارے جسم سے لپٹے کپڑوں کے اک اک دھاگے میں
ٹھنڈے رنگوں کی نفاست بہتی ہے
تمہاری باتیں جیسے
پتھروں پر بہتے پانی کی آواز چرا کے لائی ہیں
تمہاری یادیں جیسے
جھیل کے پانی سے لپٹی جھاگ کا پیکر اُوڑھ کے نکلی ہیں

او میرے خوابِ اَزل کے زخموں پر

میٹھا مرحم بن کے
لحظہ لحظہ اُترنے والی!
تم میں کتنی اپنائیت ہے
تمہارا نام بھی کتنا اچھا ہے
تم کتنی اچھی ہو!

میں اک عام سا شہری ہوں

میں روشنی، رنگ اور مٹّی گوندنے کی خواہش میں زندہ ہوں
میں اک عام سا شہری ہوں
جو عمر کے ایک میسّر لمحے کو
صبح تمازت سے شامِ خنک تک

ڈھالنے کی تکرار میں گم ہے

میری پیدائش پر میرے باپ نے
اللہ اکبر کے لفظوں کو پردہ شنوائی پر کاڑھا تھا
اللہ

سب

سے

بڑا

ہے
آج بھی جلسوں میں آنی والی
موٹے ٹائروں والی گاڑیوں کے آگے پیچھے

اُٹھنے والا نعرہ...... **اللہ اکبر**......
میرے ایمان کو تجدید دلاتا ہے
میری آنکھیں کتنے محدود نظارے تک ہیں
طاقت والوں کے گھروں کے آنگن میں آنے والے چاند سے
میری بینائی ناواقف ہے
کچھ لوگوں کے قدموں کی دھول میں
میرے آگے کھلا سورج بھاپ میں ڈھلنے لگتا ہے

میں اک عام سا شہری ہوں
جو روتا ہے تو آنسو مٹی پر گرتے ہیں
جس کی پلکوں کو ٹشو پیپر کا لمس نہیں ملتا

جو مرتا ہے
تو کسی اخبار میں شہہ سُرخی نہیں بنتی

الوداع کہتی ہوئی لڑکی

پھول مانوس رنگوں میں لپٹے مجھے دیکھتے ہیں

میری آنکھیں میں کم طاقتی پھڑ پھڑاتی ہے
لیکن میں اُس لڑکی کے بادلوں سے بے جسم کو چھو کے
تصویر بنتی ہوا دیکھتا ہوں
سڑک اور اس کے کنارے بچے
بور کے ننھے گالوں کے ہمراہ اُڑتے
درختوں کے سائے مجھے اپنے ہونے کا احساس دیتے ہیں
اس کی ہنسی جھیل میں بہتے پانی کی آواز کی دوست ہے
مجھ میں احساس کا رَت جگا
اُس کے بازو کی ڈھلوان پر
تیرتی نیند کو ڈھونڈتا ہے
جو صدیوں سے بازو کو تکیہ بنائے ہوئے

آنکھوں کے بستروں کا سفر کر رہی ہے
اس کے خط و خال میں شبنمی گیت ہے
جسے پھول نے شاخ سے پھوٹتے وقت گایا تھا
اُس کو، مرے ہونٹ چھونے کی حسرت میں
باغوں کی راہ داریوں کے سفر پر چلے

ایک دن وہ مرے خواب کے روزنِ بند کو کھول لیتی ہے
اُس دن سمندر کی آنکھوں سے حیرانیاں لے کے

ساون کی سیڑھی سے اُتری ہوئی بارشیں
پیاس کی کیاریوں میں پڑی رو رہی تھیں
جاتے جاتے
وہ چاند اور دیئے کے معانی بتاتے ہوئے ہنس پڑی
اور آٹے کے ڈھیر
اور بارود میں فرق سمجھاتے رونے لگی تھی

دکھ ہجرت نہیں کرتے

زندگی اپنا مفہوم
زخموں پر جمے خون میں سمجھاتی ہے
ہمارے اندر جنم لینے والی پہلی ہجرت

آنسوؤں کا موسم ہوتا ہے
جو بدن کا وطن چھوڑ کے
آنکھ کے شہر میں خیمہ زن ہوتا ہے
ہجرت کتنا بڑا حوصلہ مانگتی ہے
اسی لیے دکھ ہجرت نہیں کرتے
اُن کی جگہ ہم قربانی دیتے ہیں

پرندے گھونسلوں میں رہائش بناتے ہیں
گھر نہیں
اُن کے دکھ نہیں ہوتے
انھیں لوٹنا نہیں ہوتا

بارش کی چھتری کھلتی ہے

چاند نکلا ہے

یاد کے شہرِ محبت کی سڑک تاریک ہے
چوراہے پر جو لائیٹس جلتی تھیں
یک دَم بجھ گئی ہیں
آسماں پر ایک بادل چاند کی حدت سے ڈر کر
اُس کے پاس آتا نہیں ہے
کسی کے دل کی دھڑکن
تیز بارش کی طرح مجھ کو سنائی دے رہی ہے
ایسے لگتا ہے کوئی پاس آ رہا ہے
سبھی اعضائے حس
احساس کو تحریک میں تبدیل کرنے لگ پڑے ہیں

چاند نکلا ہے
میں گُم صُم ایک کونے میں پڑا ہوں
اپنے اندر ہوں کہ خود سے ماورا ہوں؟
رابطہ کارانِ اعصاب ایک جذبہ
تجزیے کے بعد
عصبی رَو سے حرکی عصب تک لاتے ہیں
لیکن میرے اعضائے عمل میں دَم نہیں ہے
شاید اندرونِ بدن، بیرون سے قایم نہیں ہے

چاند نکلا ہے
کسی کی یاد میں ٹوٹا ہوا ہوں
پھوٹ کر رونے لگا ہوں

موسیقی کے لیے ایک نظم

کوئی بھی دخترِ جمال
تمھارے جیسا سحر نہیں رکھتی

جھرنوں کی موسیقی کی طرح
لہروں کا حسین آہنگ
میرے لیے خوبصورت آواز بناتا ہے
جب آواز پیدا ہوتی ہے
تو سحر انگیز سمندر ٹھہر جاتا ہے
سکوت یافتہ لہریں جھلملاتی ہیں
سہلا کر گزرتی ہوائیں خوابیدہ ہو جاتی ہیں
آدھی رات کا چاند
سمندر پر اپنی چاندنی کی زنجیر بُنتا ہے
جس کا سینہ دھیمے دھیمے ایسے سانس لیتا ہے

جیسے شیر خوار بچہ سو رہا ہو
تب روح تمھارے آگے جھکتی ہے
تمھیں سُننے اور پُوجنے کے لیے
بھرپور مگر لطیف جذبے کے ساتھ
گرمیوں کے اُبھرے سمندر کی طرح

(لارڈ بائرن کی نظم A Stanza for Music کا ترجمہ)

ایک اور دن

آج کا دن بھی خالی خالی گزر گیا
سورج نے چڑھتے وقت ہی پوچھا
نہ ڈوبتے وقت مری رائے مانگی
میں نے بھی نیند کا فرغل
جس عجلت میں اُتارا تھا
اُتنے ہی آرام سے اُس کو
خود پہ دوبارہ پہن لیا

تکملہ

مٹی تھا میں ، چراغ کو درکار ہو گیا
آوارہ گرد تھا سرِ دیوار ہو گیا

قاسم یعقوب ۱۰ جون ۱۹۷۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں فیصل آباد شہر کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے منسلک ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''شاخ'' فروری ۲۰۰۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اپریل ۲۰۰۶ء میں قاسم یعقوب نے ادبی و علمی دستاویز پر مشتمل ایک اُردو جریدے **''نقاط''** کا اجراء کیا۔ جس کے اب تک آٹھ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا تحقیقی کام ''اُردو شاعری پر جنگوں کے اثرات'' نیشنل

بک فاؤنڈیشن سے اشاعت کے مراحل میں ہے۔ان دنوں اسلام آباد کے ایک سرکاری کالج سے بہ طور لیکچرر منسلک ہیں۔قاسم یعقوب ۲۰۰۰ء کے بعد منظرِ عام پر آنے والے اُن چند نوجوان ادبا میں شمار کیے جاتے ہیں، جنھوں نے بہ یک وقت نظم کے ساتھ اہم فکری و تنقیدی مضامین بھی لکھے۔